اورینٹل کالج میگزین، جلد۹۸، شمارہ۲، مسلسل شمارہ:۳۶۸، سال ۲۰۲۳ء

1984: یادداشت کے احتساب کا بیانیہ

ظہیر عباس، پی ایچ ڈی

اسسٹنٹ پروفیسر اُردو

ادارہ زبان وادبیات اردو، پنجاب یونیورسٹی لاہور

ACCOUNTABILITY NARRATIVE OF MEMORY: 1984

Zaheer Abbas, PhD
Assistant Professor of Urdu
IULL, Punjab University, Lahore

Abstract

In terms of creativity, George Orwell is one of the most prolific minds of the 20th century. His novel *1984* is examplary because of it’s political theme and it’s artistic presentation.This novel can be discussed in many contexts regarding its meaning.What we have discussed in this article is the negative sources that divert memory, eliminate it, or suppress it. Political and social powers use every tactic to control the human mind.they want to capture the memory of everyone, young as well as childern and old, so that there is no possibility of resistance.In this novel, the novelist has skilfully mapped out all kind of mental and psychological resistances. The text of the novel contains many hints about the future that can be seen in today's post modern society.In the analysis of the novel,an attempt is made to reach the logical conclusion that the totalitarian powers are gradually gaining control over the mind of the common man and are able to do whatever they want from him.

Keywords:
George Orwell, Memory, Dictatorship, Totalitarian Powers.

یادداشت انسان کو باقی جان داروں سے ممتاز کرتی ہے۔ انسان کے علاوہ کوئی دوسرا جان دار اپنی یادداشت سے کوئی کام نہیں لے سکتا۔ وہ اپنے ماضی میں نہیں جھانک سکتا اور نہ ہی اپنے حال کا جائزہ لے کر مستقبل کی پیش بندی کر سکتا ہے۔ جانوروں کی یادداشت لحاتی اور جبلی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر جب کسی جانور کا بچہ پیدا ہوتا ہے تو کچھ مخصوص وقت کے لیے وہ اس کے ساتھ نہ صرف شدید محبت کرتا ہے بل کہ اس کی محافظت کے لیے اپنی جان تک قربان کر دیتا ہے۔ جوں جوں بچہ بڑا ہوتا جاتا ہے دونوں کی یادداشت معدوم ہوتی چلی جاتی ہے۔ پھر یوں ہوتا ہے کہ کچھ عرصے بعد وہ ایک دوسرے کو بھول جاتے ہیں اور زندگی اپنی رفتار سے ویسے ہی رواں دواں رہتی ہے۔ تصور کریں اگر سبھی جان داروں کی یادداشت کا نظام انسانوں جیسا ہو تو کیا صورت ہو۔ ہر جانور ماضی کو یاد کرے۔ اچھے لمحوں کو یاد کر کے مسرت کا اظہار کرے اور تلخ یادیں اس کا جینا حرام کر دیں۔ وہ دوسروں کے ساتھ نفرت اور محبت کا اظہار کرے۔ انفرادی یادداشت اجتماعیت کا روپ دھار لے اور جانوروں کی آپس میں جنگیں ہوں۔

اس کے مقابلے میں انسانی یادداشت اسے ہمہ وقت بے قرار رکھتی ہے۔ زمانوں تک انسان اپنی یادوں کو ذہن میں محفوظ رکھ کے اگلی نسلوں کو منتقل کرتا رہا۔ زبانی بیانیے کا ایک بڑا مسئلہ یہ ہے کہ بات من و عن آگے نہیں پہنچتی۔ بتانے والا بہت کچھ چھوڑ جاتا ہے اور اپنی طرف سے اپنے مزاج کے مطابق اضافہ بھی کر دیتا ہے۔ یوں ایک ہی بات جب کئی لوگوں کے ذریعے مختلف زمانوں کا سفر طے کر کے پہنچتی ہے تو اس کی صورت بدل چکی ہوتی ہے۔ تحریری بیانیے نے انسان کا یہ مسئلہ حل کر دیا۔ زبانی بیانیے کے زمانوں میں واقعات کو محفوظ کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا یہی وجہ ہے کہ بہت کچھ ضائع ہو جاتا تھا۔ انسان ماضی میں جھانک کر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ تیسری نسل تک آتے آتے باتیں دماغ سے محو ہو جاتی تھیں۔ تحریری بیانیے نے انسان کا تعلق صحیح معنوں میں ماضی سے جوڑ دیا تھا۔ انسان کا حال اس کے ماضی کا مرہون منت ہے۔ اجتماعی انسانی دانش انسان کے مستقبل کا تعین کرتی ہے۔ انسان ماضی سے لمحہ بہ لمحہ راہ نمائی لیتا ہے تو کبھی سبق حاصل کرتا ہے اور آگے بڑھتا ہے۔ ایسا وہ صرف اپنی یادداشت اور اس کی پرکھ کے ذریعے کرتا ہے۔ یادداشت کو اب نہ صرف ذاتی بل کہ ماضی کے اہم واقعات کو برقرار رکھنے، منتقل کرنے اور ان پر غور کرنے کی اجتماعی صلاحیت سمجھا جاتا ہے۔(۱) حافظہ انفرادی و اجتماعی دونوں سطحوں پر انسان کے ماضی، حال اور اس کے مستقبل میں اپنا کردار ادا کرتا ہے، کوئی بھی شخص اس سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔

انسانی زندگی متعدد واقعات کا مجموعہ ہوتی ہے۔ کچھ واقعات کو انسان اپنی مرضی سے بیان کرتا ہے اور کچھ کو منہا کر دیتا ہے۔ یہ اس کی صواب دید پر منحصر ہے کہ وہ کس قسم کے واقعات کو ترجیح دیتا ہے اور کون سے فراموش کرتا ہے۔ دوسری صورت میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ کچھ غیر معمولی واقعات اسے یاد رہ جاتے ہیں اور معمولی وہ بھول جاتا ہے۔ زندگی جینے سے زیادہ یاد رہ جانے کا نام ہے۔ یہ قول مارکیز (۱۹۹۷۔۲۰۱۴ء Márquez):

> "Life is not what one lived, but what one remembers and how one remembers it in order to recount it."(2)

یادداشت درحقیقت انسانی خیال کا حال سے ماضی کی طرف سفر اور اس کے واپس آنے جانے کا نام ہے۔ انسان جب تک فطرت کے قریب رہا اس کا حافظہ خود اس کے لیے اور نہ ہی اس کے ہم جنسوں کے لیے کسی اہمیت کا حامل تھا۔ اس کا کردار نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس کے پاس دوسروں سے چھپانے کے لیے کچھ تھا ہی نہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ جب انسان نے خود کو کم تر اور برتر میں تقسیم کیا تو برتر انسانوں نے کم تر انسانوں کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کے لیے نت نئے جتن شروع کر دیے۔ طاقت ور نے کم زور کی کم زوریوں کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کے روزمرہ معمولات کے گرد بڑی منصوبہ بندی کے ساتھ گھیرا تنگ کرنا شروع کیا۔ انسان کو مستقل غلامی سے دوچار رکھنے کے لیے اس کے خیالات کا رخ موڑنا سب سے زیادہ ضروری ہوتا ہے۔ صدیوں سے طاقت ور انسانی ذہن کم زوروں کے مستقل ذہنی انضباط کے لیے تگ و دو کرتا رہا ہے کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ جہاں طاقت ہوگی وہیں مزاحمت بھی ہوگی۔(۳) اس امکانی اور بسا اوقات غیر امکانی مزاحمت کو کچلنے اور اس سے نپٹنے کے لیے وہ ہمہ وقت منصوبہ بندی میں مصروف رہتا ہے۔

دوسرے علوم و فنون کے مقابلے میں ادب طاقت کی ان حرکیات کا زیادہ گہرا ادراک رکھتا ہے یہی وجہ ہے ادیب جب بھی طاقت کے مرکز کو چیلنج کرتا ہے، اس کے عتاب کا نشانہ بنتا ہے۔ مقتدرہ ہمیشہ سچ سے خوف زدہ رہی ہے یہی وجہ ہے کہ وہ اسے دبانے کے لیے منظم منصوبہ بندیاں اور ہر ہتھکنڈے کا استعمال کرتی ہے۔ ایک لکھنے والا اپنے قلم کا تابع ہوتا ہے، وہ کبھی بھی اسے اپنی اطاعت پہ مجبور نہیں کرتا۔ وہ نرگسیت کا شکار طاقت ور طبقے کی توقع اور خواہش کو چیلنج کرتا ہے۔ جواب میں وہ طبقہ اس کی آواز دبانے کے لیے اپنی توانائیاں صرف کرتا ہے۔ یہ آنکھ مچولی زمانوں سے چلتی چلی آ رہی ہے۔

جس زمانوں میں جرم شائع نہیں ہوتے تھے، عوام کی آنکھ سے اوجھل رہتے تھے، درحقیقت عوام کے لیے اس زمانے میں جرم ہوتے ہی نہیں تھے، کیوں کہ مجرم وہی ہوتا ہے جو پکڑا جائے۔ بعض جرم، جرم تسلیم بھی نہیں کیے جاتے اگر جرم کا تعلق کسی مقدس نظریے کے پرچار یا مطلق العنانیت کے استحکام کے ساتھ ہو۔ مجرم وہ ہے جو ایسے رویوں کو چیلنج کرے ان پر سوال اٹھائے۔ مقتدرہ سوال اٹھانے والے دماغ سے ہمیشہ خائف رہی ہے۔ کاغذ اور قلم کے رشتے کی مضبوطی طاقت کے ناقابل تسخیر مراکز میں بھی شگاف ڈال دیتی ہے۔ جوں جوں کاغذ قلم کا رشتہ مضبوط ہوا توں توں اس رشتے کو توڑنے کے جتن بھی ہوئے۔ انسانی حافظے کی بازیافت، اس کی وجودی اور نفسیاتی الجھنوں اور پھر انھیں سلجھانے کی کوششوں میں انسان کو مزید پیچیدگیوں کا شکار کرنے میں گزشتہ تین سے چار صدیوں کا کردار ہنگامہ خیز رہا ہے۔ کتاب کی فراوانی، رسائی اور کتب بینی کی راہ سے انسانی باطن میں تاک جھانک اور ضرورت سے زیادہ آگاہی نے جدید انسان کے حافظے میں تلاطم برپا کر دیا۔ معلومات تک رسائی اور اس کی افشائی کو روکنا جدید دور میں مقتدرہ کے لیے سب سے بڑا چیلنج رہا ہے۔ انسانی ذہن اور اس کے حافظے کو قابو میں رکھنے کے جتنے جتن پچھلی ایک ڈیڑھ صدی سے کیے جا رہے ہیں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ انٹرنیٹ اور سمارٹ فون کے اس دور میں کسی بھی شخص کے لیے اپنی رازداری کو سنبھالے رکھنا تقریباً ناممکن ہو چلا ہے۔

ذہن سازی اور خیالات کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنا، من پسند خیالات کو فروغ دینا، ان پر سرمایہ کاری کرنا اور ناپسندیدہ خیالات پر قدغنیں لگانا اشرافیہ کا مرغوب مشغلہ ہے۔ انسانی حافظے اور یادداشت سے چھیڑ چھاڑ کرنا، منفی پروپیگنڈے سے رائے عامہ ہموار کرنا، غیر محسوس انداز سے یادداشت کو مسخر کر کے اس کی سمت اندازی کرنا ان غیر مرئی طاقتوں کا مرغوب مشغلہ ہے۔ بیسویں صدی میں کئی ناول نگاروں نے بالواسطہ یا بلاواسطہ ان ہمہ جائی طاقتوں کے ان رویوں پر قلم اٹھایا ہے۔ اس کی سب سے بڑی مثال کافکا (Kafka ۱۸۸۳ء۔۱۹۲۴ء) کے ناول ہیں۔ **قلعہ** اور **مقدمہ** بلاشبہ غیر واضح طاقتوں اور ان کے پراسرار طریقہ کار پر لکھے گئے خوف ناک ناول ہیں۔ لوگوں کی نجی زندگیوں تک رسائی، پھر اپنی مرضی سے ان کے لیے سزا و جزا تجویز کرنا اور انھیں بقائمی ہوش و حواس قبولیت کی طرف مائل کرنے پہ مجبور کرنا یہ ان ناولوں کے موضوعات ہیں۔ جرم کی تکرار اور بھول بھلیوں میں الجھانے والی ان دیواروں کے پیچھے موجود طاقتوں سے خلاصی موت کی قبولیت ہی سے ممکن ہوتی ہے۔ چار دیواری اور نجی زندگی کی پامالی پر انسان موت

کو ترجیح دیتا ہے جب کہ مقتدرہ اس بد تہذیبی کو اپنا حق سمجھتی ہے۔ قوت جیسے جیسے غیر واضح ہوتی جاتی ہے، اس کا تقاضا بڑھتا جاتا ہے کہ لوگوں کی نجی زندگیاں کلیتہ شفاف ہو کر (کھل کر) سامنے آجائیں۔ کسی شہری کو ہرگز یہ حق حاصل نہیں کہ وہ پارٹی یا ریاست سے کوئی بھی شے مخفی رکھے بالکل اسی طرح جیسے کسی بچے کو اپنے ماں باپ سے کوئی چیز چھپانے کا حق حاصل نہیں۔ مطلق العنان معاشرے اپنے پراپیگنڈے کے ذریعے بڑی دل کش مسکراہٹ کی تشہیر کرتے ہیں۔(۴)

بیسویں صدی میں جارج آرویل(۱۹۰۳۔۱۹۵۰ء George Orwell) نے یادداشت یا حافظے کا دھارا انسانی دماغ کی زرخیزی سے موڑ کر بنجر میدانوں کی طرف موڑنے والی طاقتوں کا جس طرح محاسبہ کیا اس کی نظیر نہیں ملتی۔ جارج آرویل کا نام اس کے دو عظیم ناولوں **اینیمل فارم** اور ***1984*** کی بہ دولت عالمی ناول میں ہمیشہ زندہ و جاوید رہے گا۔***1984*** ایک خالص سیاسی موضوع پر لکھا گیا شاہ کار ناول ہے۔ تخلیق کار کے دماغ میں وہ نظریہ اگر پہلے سے راسخ ہو جس پر وہ لکھنا چاہ رہا ہے تو اس کو آرٹ بنانا اس کے لیے کسی چیلنج سے کم نہیں ہوتا۔ بہ ہر حال آرویل ایک تخلیقی صلاحیت رکھنے والا ناول نگار ہے جس کے ساتھ ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ۱۹۴۹ء میں شائع ہونے والا یہ ناول بلاشبہ بیسویں صدی کے عظیم ترین ناولوں میں سے ایک ہے۔ اس ناول کی شہرت کا یہ عالم ہے ایک سال میں اس کی چالیس لاکھ کاپیاں فروخت ہو گئیں۔ اس ناول کا کم و بیش دنیا کی ہر زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اردو میں سب سے بہتر ترجمہ صاحب اسلوب فکشن نگار ابوالفضل صدیقی نے کیا۔ آمریت کے استحکام کی سفاکانہ منصوبہ بندی اور عین فطری انداز میں اس کے کام یاب نفاذ کی ایسی صورت کہیں اور نظر نہیں آتی۔ ذہنی و جسمانی تشدد پر عالمی ادب میں کئی عمدہ ناول لکھے گئے ہیں لیکن انسان زندہ رکھ کر اس کے نظریات کی کایا کلپ کر دینا ایک مشکل کارگزاری ہے، یہی اس ناول کا مرکزی موضوع ہے جو اسے دوسرے ناولوں سے ممتاز کرتا ہے۔ یادداشت کی کھرچن، اس کا رخ موڑ دینا، اسے اپنے مطابق ڈھالنا اور مستقبل کی پیش بندی کرنا اس ناول کا بنیادی موضوع ہے۔

ونسٹن ناول کا مرکزی کردار ہے جو مستقبل سازی کا نمائندہ ہے۔ اپریل کے صاف اور سرد دن وہ اس عمارت میں داخل ہوتا ہے جہاں وہ سالوں سے کام کر رہا ہے۔ دیواروں پر آنکھیں ہی آنکھیں جو ہر آنے جانے والے کو گھور رہی ہیں۔ دیکھنے والے میں اتنی جرات نہیں ہے کہ وہ لحہ بھر کو ان آنکھوں میں دیکھ لے مبادا کہیں وہ ان کے دماغ میں جنم لینے والے ان خیالات کا بھی محاسبہ کر لیں جن کا ابھی امکان بھی نہیں

ہے۔ در حقیقت یہ گھنی، سیاہ مونچھوں اور کھردرے چہرے والا پینتالیس سالہ شخص ہے جس کی تصاویر جا بہ جا چسپاں ہیں اور ہر تصویر کے نیچے لکھا ہے "بڑا بھائی دیکھ رہا ہے"۔ تصویر کی نگاہیں اگرچہ دیکھنے والے کو گھور رہی ہیں لیکن یہ جملہ پڑھتے ہی دیکھنے والے کی ریڑھ کی ہڈی میں خوف کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ در حقیقت یہ آج کی پیش بندی ہے جب حساس علاقوں سے عوام کا گزر ہوتا ہے اور دیواروں پہ لکھا ہوا دیکھتے ہیں کہ "خبر دار کیمرے کی آنکھ آپ کو دیکھ رہی ہے"۔ کیمرے کے پیچھے کوئی ہے یا نہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ونسٹن اس کی نگاہوں کی تاب سے بچتا ہوا اپنے آفس میں پہنچتا ہے۔ ونسٹن پارٹی پالیسی کے خلاف توڑتی ہوئی مزاحمت کا آخری کردار ہے جو بہ قول میلان کنڈیرا (پ: ۱۹۲۹ء Milan Kundera) "اقتدار کے خلاف آدمی کی جدوجہد فراموشی کے خلاف حافظے کی جدوجہد ہے۔"(۵) پورے ناول میں ونسٹن انتظار حسین (۱۹۲۵۔۲۰۱۶ء) کے آخری آدمی کی طرح اپنے حافظے اور تاریخ کے اصلی اور آنکھوں دیکھے واقعات کو محفوظ کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن ناکام ہوتا ہے۔ در حقیقت جس محکمہ سے اس کا تعلق ہے اس کی ذمہ داری تاریخی واقعات اور پہلے سے شائع شدہ اعداد و شمار میں بہ وقت ضرورت ردو بدل کرنا ہے۔ بدلتے حالات کے تناظر میں بڑے بھائی کے بیانات، معاشی پالیسیوں میں تبدیلیاں، جھوٹ کو سچ، سچ کو مزید سچ میں تبدیل کرنے کی بھاری ذمہ داری اس کے سر ہے۔ پچھلی فائلیں اور کاغذات آگ کی بھٹیوں میں فوری جھونک کر جلا دیے جاتے ہیں۔ یہ تسلسل ونسٹن کے حافظے پر بہ راہ راست اثر انداز ہو رہا ہے۔ اپنے حافظے کی تجدید کے لیے وہ ایک ڈائری خرید کر اس پہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کا ارادہ کرتا ہے۔ معدوم ہوتی یادداشت اور غائب ہوتے الفاظ کو محفوظ کرنے کی منہ زور خواہش اسے ایسا کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ پارٹی کے ہاتھوں تلف ہوتے حقائق سے زیادہ وہ اپنی انفرادی یادداشت کو بنجر ہوتا دیکھ رہا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ کردار سائے کی طرح آ جا رہے ہیں مکالمہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ سو روزنامچہ خود کلامی کی بہترین صورت ہے۔ خود سے ہر وہ بات کی جا سکتی ہے جو کسی بھی دوسرے شخص کے ساتھ کرنا ممکن نہیں ہوتی۔ سو خطرے میں گھِرا ہوا شخص مقتدرہ کے سفاکانہ رویے کو اپنی زندگی کی قیمت پر چیلنج کرنے کا ارادہ کرتا ہے۔ اپنے حافظے کا تحفظ انسان ہر قیمت پر کرنا چاہتا ہے۔ پہلے وہ پارٹی کے خلاف اس پر پورا زہر اگل دیتا ہے لیکن ساتھ ہی اسے یہ فکر بھی لاحق ہو جاتی ہے کہ کہیں وہ پکڑا نہ جائے۔ پارٹی نے ذہن سازی کا ایسا جال بچھایا ہے کہ کسی بھی فرد کے لیے بچ نکلنا ممکن ہی نہیں ہے۔ نوجوانوں، بچوں اور بوڑھوں کے لیے ان کے

پاس جدا جدا حکمت عملیاں ہیں۔ یوں تو ہر نظریے کے کرتا دھرتاؤں کے پاس مخالفت کرنے والوں کے لیے کڑی سے کڑی سزا ہے لیکن یہاں صورت حال قدرے مختلف ہے، کردار کو زندہ رکھو لیکن اس کے گرد خوف کی اک ایسی دیوار کھڑی کردو کہ وہ ہر پالیسی پر عمل درآمد کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہے۔ کردار کو زندہ رکھنا اور غیر محسوس طریقے سے اس کے اندر ہر وہ بیانیہ منتقل کرنا جس سے پارٹی مضبوط ہو، ان کا مطمح نظر ہے۔

پارٹی کی نظر صرف پارٹی سے منسلک لوگوں پر ہی نہیں ہے بل کہ وہ ارد گرد موجود لوگوں پر بھی گہری نظر رکھتی ہے۔ بچوں کے حافظے کو قابو کر کے حال اور پھر مستقبل میں اس سے کیا کام لینا ہے؟ بوڑھوں کی یادداشت کو کیسے غیر موثر کرنا ہے؟ بڑوں کو اپنے قابو میں رکھنے کے لیے جہاں ان کے پاس اور بہت ہتھکنڈے ہیں وہیں سب سے بھیانک بچوں کی تربیت ہے۔ بچے کی معصومیت کو سفاکیت میں تبدیل کر کے اپنے ہی والدین پر نظر رکھنے کی سب سے خوف ناک مثال ہے۔ بچے کا دماغ ایک خالی سلیٹ کی طرح ہوتا ہے۔ اس کی سوچ کے دھارے کو کسی بھی طرف بہ آسانی موڑا جا سکتا ہے۔ اس ناول میں بچوں کو قتل وغارت گری اور سرعام ہونے والی پھانسیوں کے مناظر دکھائے جاتے ہیں۔ بچے کا دماغ بالکل روبوٹ کی طرح خودکار طریقے سے کام کرتا ہے۔ اس کی اپنی کوئی سوچ یا فکر نہیں ہوتی۔ خود ایسے معاشروں میں جہاں نظریات کی اہمیت رشتوں کے تقدس سے زیادہ ہوتی ہے، ایک بچہ نہایت خوف ناک کردار کے روپ میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ گوشت پوست کے انسان سے زیادہ غیر مرئی ہستیوں کی اہمیت ہوتی ہے۔ بچے کی معصومیت چھین کر خفیہ والے انھیں اپنے ہی والدین کی نگرانی پر لگا دیتے ہیں۔ اس ناول میں ہمیں کوئی ایسا بچہ نظر نہیں آتا جو بچپن کی زندگی جی رہا ہو۔ کنڈیرا کا یہ کہنا کہ "بچوں کا بہ ہر حال کوئی ماضی نہیں ہوتا۔ بس یہی ان کی مسکراہٹوں میں ساحرانہ معصومیت کے راز کا سبب ہے۔"(٦) یہاں ایسی کوئی صورت نہیں ہے، وہ اپنی عمر کے لحاظ سے تو بچپن میں ہی ہیں لیکن اپنے اطوار کے لحاظ سے خوف ناک آتشیں ہتھیار ہیں۔ ان کی مسکراہٹیں ساحرانہ نہیں زہر میں بجھے ہوئے تیروں کی طرح ہیں۔

ونسٹن جب مسز پارسنز کے گھر جاتا تو اسے اس مضحکہ خیز لیکن خوف ناک صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے جب ان کے بچے اس پر کھیلنے والا پستول تان لیتے ہیں۔ بچوں کے لیے ان سارے معاملات کی حیثیت ایک کھیل جتنی ہی ہے لیکن وہ اس بات سے نابلد ہیں کہ وہ کون سا خطرناک کھیل کھیل رہے

ہیں۔ان کے حافظے سے غیر محسوس طریقے سے تمام فطری خیالات نکال کر غیر فطری اور سنگ دِلانہ قسم کی مصنوعی ذہانت بھر دی جاتی ہے۔ان کے لیے اپنے ہی والدین کے عقائد کی ٹوہ لینا، راہ جاتے ہووں پر غدار کا نعرہ لگانا اور خوف زدہ ہو جانے والوں کی پارٹی کو شکایت لگانا معمول کی کارروائی ہے۔پارٹی بچوں پر خاص طور پر اپنی توجہ مرکوز کیے ہوئے ہے اور مطلوبہ نتائج حاصل کر رہی ہے۔ کھیل کود کی صورت بہت خطرناک ہے۔یہی وہ نسل ہے جو ۱۹۸۴ء میں اپنے عروج پر ہو گی۔ونسٹن کا تعلق جس نسل کے ساتھ ہے وہ نسل اب جوان ہو چکی تھی۔اس کا ایک ماضی تھا، حافظہ تھا اور کچھ سابقہ نظریات تھے جن کی وجہ سے ان کا دماغ شکوک وشبہات کا شکار بھی ہوا۔اس نسل کو مکمل طور پر قابو کرنے کے لیے پارٹی کو بہت محنت کرنی پڑ رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پارٹی اس نسل کو قابو کرنے کے ساتھ ساتھ مستقبل کے لیے ایک ایسی نسل تیار کر رہی ہے جس پر کوئی محنت نہ کرنی پڑے۔یہ بچے نہ ہی سکول جاتے ہیں اور نہ ہی ان کا کتاب سے کوئی تعلق ہے۔آلڈس ہلسکے (۱۸۹۴۔۱۹۶۳ء Aldous Leonard Huxley)کے مطابق یہ وہ نسل ہے جو پھولوں اور کتابوں سے جبلی طور پر نفرت کرتی ہے۔(۷) کتاب شعور کو پروان چڑھاتی ہے، حافظے کو جلابخشتی ہے جب کہ پھول فطرت سے محبت کی علامت ہے۔طاقت ور طبقہ پوری کوشش سے لوگوں کو کتاب سے دور کرتا ہے تاکہ ان کا شعور غیر متحرک رہے اور ان کے ذہنوں میں سوال نہ پیدا ہو جائیں کیوں کہ سوال سے اشرافیہ ہمیشہ خائف رہی ہے۔اس ناول میں بچوں کے دماغوں میں سوال پیدا ہونے سے پہلے ہی ان میں گھڑے گھڑائے جوابات بھر دیے گئے ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ ہر طرف بے خوف وخطر پھرتے ہیں۔

بچوں کے علاوہ بوڑھوں کی یادداشت ان کے لیے سب سے بڑا چیلنج ہے۔وہ اپنی موجودہ اور آنے والی نسل سے حقائق چھپانے کے لیے بوڑھوں پر بھی محنت کرتے ہیں۔وہ نہیں چاہتے کہ ماضی کا کوئی بھی واقعہ جس سے پارٹی کی سبکی ہو، اس کی بھنک بھی موجودہ نسل کو پڑے۔ونسٹن کا تعلق ہی ایسے شعبے سے ہے جس کی ذمہ داری ماضی کے واقعات میں ردوبدل ہے تاکہ پڑھنے والے کو پتہ نہ چل سکے کہ در حقیقت ہوا کیا ہے؟اس کے پاس ماضی میں موجود ہونے والے واقعات جاننے کے لیے کوئی متن نہیں۔جن متون میں وہ ردوبدل کرتا ہے ان کے بارے میں وہ یہ جاننے سے قاصر ہے کہ ان میں کتنے فی صد سچائی ہے؟وہ کسی ایسے شخص سے ملنے کے بارے میں سوچتا ہے جس کے پاس درست معلومات ہوں تاکہ وہ انھیں اپنے روزنامچے میں درج کر سکے۔بوڑھے بالعموم دانش مندی کی علامت سمجھے جاتے ہیں۔جن کے پاس ماضی کا وسیع تجربہ

ہوتا ہے۔ وہ نوجوانوں کی مستقبل کے بارے میں بہتر راہ نمائی کر سکتے ہیں۔ ایسے ہی ایک کیفے میں ونسٹن کی ایک بوڑھے سے ملاقات ہوتی ہے۔ وہ ان سب حقائق کی پرکھ کے لیے اس سے مکالمہ کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ ونسٹن کا خیال ہے کہ ماضی کے واقعات کے بارے میں سچ تک پہنچنے کا واحد ذریعہ عوام ہی ہیں جنھوں نے جنگ کا دورانیہ خود پر جھیلا۔ اس روز اپنے روزنامچے میں بھی وہ یہی لکھتا ہے۔ سو بوڑھے دکان دار کو وہ اسی مقصد کے لیے کریدنے کی کوشش کرتا ہے کہ یہ جو پارٹی تکرار سے اس بات کا اعادہ کرتی ہے کہ ماضی بہت شان دار تھا، کوئی مسائل نہیں تھے۔ پارٹی اپنی فتوحات اور خوش حالی کے بارے میں جو دعوی کرتی ہے کیا وہ سب سچ تھا؟ بوڑھا اس کے تمام سوالوں کے غیر متعلقہ جواب دیتا ہے۔ اس کے جوابات میں کوئی ایک بھی ایسا اشارہ نہیں ہے جس سے یہ اندازہ لگایا جاسکے کہ ماضی میں کیا ہوا تھا۔ بوڑھے کے ماضی کو ایسے کمال انداز سے کھرچ دیا گیا ہے کہ اب وہ چاہ کر بھی اپنی زبان پر سچ نہیں لا سکتے۔ انھوں نے تحریری بیانیے کے ساتھ زبانی بیانیے کا رخ بھی موڑ دیا ہے تاکہ جو نئی دنیا تخلیق کی جائے اس میں حقیقی ماضی نام کی کوئی چیز نہ ہو۔ ماضی صرف وہی ہو جو پارٹی نے تخلیق کیا ہے۔ سچ کوئی جامد چیز نہیں ہوتا بل کہ وہی بن جاتا ہے جس کی تکرار کی جائے اور جس پر سچ ہونے کا زور دیا جائے۔

ایک نسل کے بوڑھے اگر خاموش ہو جائیں یا کتابوں کے متن بدل دیے جائیں یا وہ تمام دستاویز تلف کر دی جائیں یا چھپالی جائیں تو اگلی نسل جس بیانیے کے پیچھے چلے گی وہی سچ مانا جائے گا۔ خود ہمارے ہاں قیام پاکستان (۱۹۴۷ء) سے لے کر تا حال جس بیانیے پر زور دیا جاتا ہے وہ وہی ہے جسے محنت کر کے رائج کیا گیا۔ یہی وجہ ہے ہم مسلسل ایسی نسلیں تیار کر رہے ہیں جو تذبذب کا شکار ہیں۔ مقتدرہ کے نزدیک جھوٹ، سچ اور اخلاقیات کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ وہ آنے والی نسل کے لیے اپنی مرضی کا سچ گھڑتی ہے۔ وہ جانتی ہے کی تاریخ اپنے عہد میں رونما ہونے والے واقعات پر مبنی نہیں ہوتی بل کہ وہ ہوتی ہے جو صفحۂ قرطاس پر زندہ رہتی ہے۔ اگر ماضی کا سچ واضح ہو کر سامنے آجائے تو وقت کا دھارا ممکن ہے متضاد سمت میں چلنا شروع ہو جائے۔ عہدِ موجود کی نسل پچھلی نسل کے لکھے ہوئے کو سچ سمجھ کر ہی مستقبل کی پیش بندی کرتی ہے۔ سچ کا وہ تصور یہاں باطل ہو جاتا ہے جو قصے کہانیوں اور اخلاقی ملفوظات کی زینت بنتا ہے۔ یہاں سچ وہی ہے جو دکھانا مقصود ہے۔

جہاں پارٹی کی گرفت عوام کے ذہنوں پر اتنی مضبوط ہے کہ وہ خوف کی وجہ سے زبان سے ایک لفظ تک نہیں نکال سکتے تو دوسری طرف پارٹی کو اپنی طاقت کے بڑھاوے کے لیے صرف ایسے افراد درکار ہیں جو دماغ کو اپنی مرضی سے استعمال میں نہ لائیں۔ذہین آدمی پر ان کی گہری نظر ہوتی ہے۔ہر رکن جو پارٹی کے معاملات پر سوال اٹھائے، اس کی سرکوبی فرض ہو جاتی ہے۔پارٹی میں آنے کا ایک ہی راستہ ہے۔ واپسی کے صرف دو راستے ہیں، مکمل ذہن سازی یا موت۔سائیم ایک ایسا ہی کردار ہے جس کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ ایک ایسی لغت تیار کرے جس میں مترادفات، متضاد یا ایک ہی لفظ کے متنوع معنی درج نہ ہوں۔یوں الفاظ کا دائرہ محدود ہوتا چلے جائے گا۔ معنی صرف وہی ہوں گے جو لغت میں درج ہوں گے۔انسان اپنی طرف سے کوئی ایسا لفظ نہیں بول پائے گا جو لغت میں درج نہ ہو گا۔ معنی متعین ہونے کی وجہ سے سننے والا مفہوم کے ادراک کے حوالے سے کسی ابہام کا شکار نہیں ہو گا۔انسانی دماغ تصویری صورت میں سوچتا ہے لیکن وہ اظہار ہمیشہ لفظ کے ذریعے کرتا ہے۔کسی بھی شخص کے پاس لفظی دائرہ جتنا وسیع ہو گا اتنا ہی وہ اظہار کی قدرت پہ زیادہ ہو گا۔سائیم بڑے فخر سے ونسٹن کو اپنی اس غیر معمولی صلاحیت کے بارے میں بتاتا ہے۔

> ”اب ہم زبان کو آخری شکل دینے میں مصروف ہیں۔جب زبان یہ اختیار کرلے گی تو پھر کوئی دوسری زبان میں بات چیت نہیں کر سکے گا۔جب ہم اس کو پایہ تکمیل تک پہنچا لیں گے، تو آپ جیسے لوگوں کو اسے دوبارہ سیکھنا پڑے گا۔شاید آپ سمجھتے ہوں گے، ہمارا کام نئے الفاظ گھڑنا ہے۔بالکل نہیں، ہم تو الفاظ کو فنا کے گھاٹ اتار رہے ہیں۔ہر روز بیسیوں نہیں بل کہ سیکڑوں الفاظ محو کیے جا رہے ہیں۔ہم تو الفاظ کے ذخیرہ کو ناگزیر حد تک کم کر رہے ہیں۔گیارھویں ایڈیشن میں کوئی ایسا لفظ باقی نہیں رہے گا جو ۲۰۵۰ء تک متروکہ الفاظ کی فہرست میں شامل کیا جا سکے۔“(۸)

لفظ کو لغت تک محدود کرنے کا مطلب ہے علامت، استعارے اور تخیل کی موت۔پارٹی کو سب سے زیادہ خطرہ تخلیق کاروں سے ہے۔ تخلیق کار کا لکھا ہوا معنیاتی نظام میں ہل چل مچا کر اسے وسعت اور گہرائی بخشتا ہے ۔یہی وجہ ہے کہ جیفری چاسر (۱۳۴۰۔۱۴۰۰ء Geoffrey Chaucer)، شکسپیئر (۱۵٦۴۔ ١٦١٦ء Shakespeare) ، جان ملٹن (١٦٠٨۔١٦٧۴ء John Milton)اور جارج بائرن (١٧٨٨۔١٨٢۴ء George Byron) کی تخلیقات کے آفاقی معنیاتی ساخت سے خائف ہو کر پارٹی من مرضی کا نظام لانا چاہتی ہے جسے وہ نیوسپیک کا نام دیتی ہے۔اس سسٹم کے اندر نہ صرف معنی محدود ہو گا

بل کہ الفاظ کو من مرضی کے معنی کا لباس بھی پہنایا جا سکتا ہے۔ جیسے غلامی آزادی ہے، جنگ امن ہے۔ جہالت طاقت ہے۔ ان جیسے اور ان کے معنی کو جب تکرار سے دہرایا جائے گا تو اس کے اصل معنی متروک ہو جائیں گے اور ان کی جگہ مصنوعی معنیاتی نظام لے لے گا۔ جارج آرویل کی نظر مستقبل میں بہت دور تک دیکھ رہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ناول میں ۲۰۵۰ء کی صورت حال دکھا رہا ہے۔ آج مصنوعی ذہانت کے عہد میں جی رہے ہیں۔ اور کچھ بعید نہیں ہے کہ آنے والے زمانوں میں کوئی ایسا نظام آ جائے جب کسی ایک انسان کے دماغ میں ابھرنے والے خیال کا ابلاغ دنیا کے ہر شخص کو ہونا شروع ہو جائے۔ انسانوں کی نجی زندگیوں تک رسائی آج کے زمانے میں غیر محسوس طریقے سے بہت زیادہ ہو گئی ہے۔ آج سے کم و بیش پچھتر سال پہلے کی گئی سایئم کی پیش گوئی سچ ثابت ہو رہی ہے۔ ذرا غور کریں کیا کمپیوٹر، انٹرنیٹ یا مشین کے اجارہ دارنہ دور میں یہی نہیں ہو رہا؟ اپنا پیغام دوسروں تک بروقت پہنچانے کے لیے کیا آج کا انسان مخففانہ الفاظ کا استعمال نہیں کر رہا؟ کیا ایک بین الاقوامی سسٹم میں آ جانے کی وجہ سے الفاظ نے کوڈز کی حیثیت اختیار نہیں کر لی؟ آپ کوئی لفظ یا جملہ لکھ دیں جو سسٹم کو پسند نہیں ہے تو آپ کا اکاونٹ بلاک ہو جاتا ہے۔ ۲۰۵۰ء تک صورت حال ویسی ہی ہو جائے گی جس کی پیش گوئی ۲۰۵۰ء سے ایک سو ایک سال پہلے ناول لکھ کر جارج آرویل نے کی تھی۔ ہم غیر محسوس انداز میں ہنسی خوشی عالم گیر لغت کا حصہ بن چکے ہیں۔ ہر لمحہ ایک بڑا بھائی کہیں دور بیٹھا ہماری ہر حرکت نوٹ کر رہا ہے۔

بچوں، بوڑھوں اور فطین نوجوانوں کے دماغوں، ان کے حافظے اور یادداشت کو مکمل قابو کرنے کے ساتھ باغی اذہان کا رخ موڑنا پارٹی کا سب سے مقبول مشغلہ ہے۔ ونسٹن ناول کا مرکزی کردار ہے اسی کے ذریعے ہماری سب کرداروں سے ملاقات ہوتی ہے۔ یہ کردار غیر ارادی طور پر مجہول انداز میں پارٹی سے بغاوت کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ پارٹی سے بغاوت کی کئی صورتیں ہیں۔ سب سے اہم یہ ہے کہ کسی بھی شخص کو کہیں بھی اپنی مرضی سے کچھ بھی لکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ پارٹی ہی اس کا دماغ ہے۔ وہ وہی سوچے گا جو پارٹی کہے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان محض دماغ نہیں ہے۔ وہ متضاد اور بسا اوقات نہایت پیچیدہ ذہنی کیفیات میں مبتلا ہوتا ہے۔ جذبات و احساسات کی تلفی کسی صورت ممکن نہیں ہوتی۔ جبلت اپنا راستہ خود نکالتی ہے۔ ونسٹن نوجوان ہے، پارٹی نے اس کے احساسات کو مسخ ضرور کیا ہے لیکن اس کے جسم میں ایک محبت کرنے والا دل موجود ہے۔ عمارت میں کئی اور لوگ بھی ایسے ہیں لیکن کوئی کسی پہ اعتبار نہیں کر سکتا۔ سبھی

دوسروں کو خفیہ پولیس کے کارندے سمجھتے ہیں۔ ایسے عالم میں وہ ایک بے باک قدم اٹھانے کا فیصلہ کرتا ہے اور وہ ہے محبت۔ محبت انسانی حافظے کی کلید ہے۔ انسانی زندگی کی خوب صورت یادوں کا تعلق محبت سے ہے۔ زندگی کی تلخیاں خوش گوار یادوں میں بہہ جاتی ہیں۔ انسان مستقبل کو محفوظ کرنے کے لیے محبت کا سہارا لیتا ہے۔ محبت اپنی ماہیت میں نہایت نجی معاملہ ہوتا ہے۔ نظریہ انفرادی محبت کا قتل سب سے پہلے کرتا ہے۔ ونسٹن اپنی انفرادیت کو بچانے کے لیے تمام کوششیں کرتا ہے لیکن بالآخر ناکام ہوتا ہے۔ وہ اپنی طرف سے پارٹی سے ہر کام خفیہ طور پر کرتا ہے لیکن وہ بھول جاتا ہے کہ اس کے ہر کام اور ہر خیال پر پارٹی کی نظر ہے۔

جولیا اس ناول کا واحد متحرک نسوانی کردار ہے۔ اس کی سرشت میں ابھی تک باغیانہ عناصر موجود ہیں۔ سوبڑی حکمت عملی سے ان کا ملاپ کروایا جاتا ہے۔ محبت اور جنسی تعلق دو انسانوں کا نہایت نجی معاملہ ہے۔ جن جگہوں میں وہ ملتے ہیں ہر جگہ ان پر خفیہ والوں کی گہری نظر ہے۔ جس مکان میں وہ ملاپ کرتے ہیں وہ بھی ایک خفیہ پارٹی ورکر مسٹر چیرنگٹن کی ملکیت ہے۔ ونسٹن کی طرح جولیا بھی پارٹی پالیسی سے نفرت کرتی ہے۔ ونسٹن کے مقابلے میں زیادہ جارحانہ خیالات کی مالک ہے اور پارٹی کی حکمت عملی کا بڑی باریک بینی سے جائزہ لیتی۔ ایک ملاقات میں وہ اس حقیقت کو یوں بیان کرتی ہے۔ "جب تم اظہار محبت کرتے ہو، تمھاری قوت صرف ہوتی ہے اور اس سے تمھیں جو راحت اور مسرت ہوتی ہے۔ اس کے بعد تم کسی دوسری طرف مطلق توجہ نہیں کرتے۔ وہ تم کو اس حالت میں دیکھنا پسند برداشت نہیں کر سکتے۔ وہ تمھیں ہر وقت توانا اور قوت سے لب ریز دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ جلسے جلوس، یہ تحسین و آفرین، یہ نعرے اور پرچم سب جنسی کج روی کے ہیجان کا شاخسانہ ہیں۔"(۹) جولیا بھی سائیم کی طرح ہی ایک ذہین کردار ہے لیکن پارٹی کے لیے اس جیسی خوف ناک نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ پارٹی اس کے منہ زور جذبات کی سرکوبی کا فیصلہ کرتی ہے۔ انھیں ایک حکمت عملی کے تحت ملنے دیا جاتا ہے تاکہ ان کے اندر سے انسانی جذبے کی سب سے خوب صورت قدر کا زہر بھی نکل جائے۔ وہ اس بات سے بے خبر ہیں کہ خفیہ پولیس کی آنکھیں ہر جگہ انھیں دیکھ رہی ہیں، اپنی طرف سے چھپ چھپا کر ایک دوسرے سے ملتے رہے۔ جب اچھی طرح وہ ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو گئے تو بالآخر دھر لیے جاتے ہیں۔ اوبرائن جسے شروع میں ونسٹن اپنے جیسا ہی باغیانہ خیالات کا حامل انسان سمجھتا ہے در حقیقت ایک سفاک کارندہ ہے جو تشدد کے ذریعے ذہن سازی

کرتا ہے۔اوبرائن تشدد کے ساتھ ساتھ اس سے مسلسل گفت گو میں بھی مشغول ہے۔اس کے لہجے میں دردناکی اور افسوس کی لہریں ملی جلی ہیں۔یوں لگتا ہے جیسے وہ ونسٹن سے محبت کرتا ہے اور اس پر تشدد کرنا اختیاری نہیں بل کہ جبری عمل ہے۔وہ خودکار طریقے سے اسے سزا بھی دے رہا ہے اور اس کے دماغ سے اٹھنے والے سوالات کے جوابات بھی دیے جاتا ہے۔اس کے لب و لہجے کا تیقن اور حاکمانہ انداز گفت گو سے قاری کے لیے اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے جو وہ چاہے گا وہی ہو گا۔اوبرائن کا یہ نکتۂ نظر پارٹی پالیسی کا عکاس ہے:

> ”اب آیندہ تمھارے دل میں کبھی عام انسانی جذبے کی لہر پیدا نہیں ہو گی۔تمھارے اندر زندگی بے روح ہو جائے گی۔اب تم کسی کے دوست بن سکو گے نہ کسی سے محبت کرنے کے اہل رہ سکو گے،نہ ہنس سکو گے اور نہ زندگی کے کسی پہلو سے لطف اندوز ہو سکو گے۔سوچ بچار،جرات اور استقامت سے بالکل تہی دامن ہو جاؤ گے،متحرک لاش۔اور ہم تمھیں بالکل خالی کر دیں گے اور پھر تمھارے جسم و جاں میں ہم ہی ہوں گے۔“(۱۰)

بدترین تشدد کے دوران موت ایک بڑی نعمت بن کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ناقابل برداشت لمحوں میں موت کا تصور ایک محبوب ہستی کی صورت انسان کے دماغ میں آتا ہے جس کی آغوش میں جانے کو وہ بے قرار ہوتا ہے۔تشدد کے منفرد اور غیر متوقع طریقے انسان کی روح کو تشدد کے عمل سے زیادہ تشدد کے درمیانی وقفوں میں بے قرار رکھتے ہیں۔***1984*** میں تشدد کا عمل ایک جوہری کے عمل کی طرح ہے جو خام مال کو کندن بنانے میں مشغول ہے۔جن باغیوں کو موت کے گھاٹ اتارنا ہوتا ہے وہ تشدد سے بچ جاتے ہیں۔جن کی ذہن سازی کرنی ہو صرف وہی اس بدترین تربیت کے عمل سے گزرتے ہیں۔ونسٹن اور جولیا دونوں ایسے ہی کردار ہیں۔محبت کرنے والے لچک دار رویے کے حامل انسان ہوتے ہیں انھیں بدلنا ان کی سوچوں کے دھارے موڑنا قدرے آسان ہوتا ہے۔نظریے کی طاقت کے سامنے انسان زیادہ دیر اپنی انفرادیت برقرار نہیں رکھ پاتا۔ونسٹن اپنی یادداشت کو محفوظ کرنے کے جتنے طریقے آزماتا ہے ناکام ہوتا ہے۔روزنامچہ لکھنے کی کوشش،بوڑھے سے ماضی کے حقیقی واقعات کی جاننے کا معاملہ اور پھر آخر میں محبت کی آغوش میں پناہ لینے کی کوشش ہر جگہ ناکامی اس کا مقدر رہے۔اوبرائن کی ساری توجہ جولیا کے ساتھ اس کی محبت پر ہے۔تشدد کے دوران وہ پارٹی کی محبت کو جولیا کی محبت سے بدل دیتے ہیں۔اذیت ناکی کے دوران بار بار جو جملہ اسے سننے کو ملتا ہے وہ یہ ہے کہ جو سزا اسے مل رہی ہے وہ اگر جولیا کو دے دی جائے تو اسے چھوڑ دیا

جائے گا۔ اگر وہ بڑے بھائی سے محبت کا نعرہ لگائے گا تو اس کی گلو خلاصی ہو جائے گی۔ وہ آخر تک جولیا سے محبت کے معاملے میں مزاحمت کرتا ہے لیکن ایک فیصلہ کن سزا کے سامنے اس کی ہمت جواب دے جاتی ہے۔ جب وہ آدم خور چوہے اس کے پیٹ کے راستے اس کے جسم میں داخل کرنے کا فیصلہ کرتے ہیں تو وہ چیخ اٹھتا ہے، اس کے منہ سے بے اختیار آوازیں نکلتی ہیں:

> ”جولیا کو سزا دو، جولیا کو، مجھے نہیں، جولیا کو۔ مجھے کوئی پروا نہیں تم اسے کیا سزا دو گے۔ اس کا چہرہ نوچ لو، اس کی ہڈیاں تک نکال لو، مجھے نہیں۔ جولیا کو سزا دو۔ مجھے نہیں۔“(۱۱)

ونسٹن جولیا سے شدید نفرت کا اظہار کرتا ہے اور پارٹی سے اٹوٹ محبت کا اعتراف کر لیتا ہے۔ اذیت ناکی کے دوران دماغ شوئی کے تمام مراحل بہ خوشی طے پا جاتے ہیں۔ پیار، محبت، حسد، غصہ اور من پسند جنسی تعلق دو ٹانگوں پر چلنے والے جانور کو انسان بناتے ہیں۔ نظریے کو انسان کی نہیں سدھائے ہوئے جانور کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسے ایسی خودکار مشین کی طرح ہونا چاہیے جو ریموٹ کے ذریعے چلے۔ وہ اب ایک پیانو کا روپ دھار چکا ہے جو آواز پیدا کرنے کے لیے کسی دوسرے کی انگلیوں کا محتاج ہے۔(۱۲) ونسٹن اور جولیا کو سزا ملتی ہے جیسے جنت میں آدم و حوا کو اپنی من مرضی کرنے پر ملتی ہے۔ خدا کی بنائی ہوئی دنیا میں اپنی مرضی نہیں چل سکتی۔(۱۳) بڑے بھائی کے کارندے ہر جگہ موجود ہوتے ہیں، وہ دونوں کرداروں کو اپنی مرضی کے مطابق کھیلنے کا موقع دیتے ہیں تاکہ انھیں قرار واقعی سزا دے کر محبت سے نہ صرف تائب ہونے پر مجبور کر دیں بل کہ ان سے وہی کام لیں جس کے لیے انھیں منتخب کیا گیا۔ ونسٹن بہ ظاہر ہر کام اپنی مرضی سے کرے لیکن اس کا اختیار یوں ہمارے ہاتھ میں ہو کہ سمجھے کہ وہ آزاد ہے اور ہر کام اپنی من مرضی سے کر رہا ہے۔

اکیسویں صدی میں اس ناول کی معنویت مزید بڑھ جاتی ہے کیوں کہ دنیا ۲۰۵۰ء کی طرف بڑھ رہی ہے۔ سائیم اس بات کی پیش گوئی پہلے ہی کر چکا ہے کہ ایک عالمی مقتدرہ کیسے دنیا بھر کے اذہان پر مکمل اختیار حاصل کر لے گی؟ فیس بک، ٹویٹر، اینڈرائیڈ، آئی فونز، موبائل کی چپ اور جا بہ جا لگے ہوئے خفیہ کیمرے در حقیقت بڑے بھائی کی آنکھوں کی طرح ہیں جو ہر فرد کے معمولات زندگی پر گہری نظر رکھے ہوئے ہیں۔ آدمی کا نقطۂ نظر ایک خودکار چھلنی کے ذریعے ہر اس جگہ پہنچ رہا ہے جس کے لیے یہ سارا جال بنا گیا ہے۔ انسان غیر محسوس طریقے سے اپنی رازداری کھو رہا ہے۔ وقت کی باگ اُن کے ہاتھ میں ہے جو

ماضی پر اپنا اختیار رکھتے ہے وہی مستقبل کو بھی اپنے اختیار میں رکھتے ہیں، جنھیں حال پر دست رس ہے اُنھیں ماضی پر بھی دست رس ہے۔(۱۴) ان کی نظر سے کچھ بھی او جھل نہیں ہوتا۔بچے، بوڑھے، عورتیں اور نوجوان سب کے دماغوں پر ان کا مکمل قبضہ ہوتا ہے۔بچے کے مستقبل کو قابو کرنا، بوڑھے کے ماضی پر توجہ کرنا اور اس کی یادداشت کو مکمل طور پر کھرچ دینا، نوجوان مرد اور عورت کے دماغ سے بغاوت کا عنصر نکال کر اس کے حال پر حکم رانی کرنا کسی بھی مطلق العنان نظریے کا خاصا ہوتا ہے۔سچ اور جھوٹ کی انفرادی حیثیت ختم ہو جاتی ہے۔اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ جنگ امن ہے یا نہیں ہے غلامی ہی آزادی ہے اور نفرت محبت ہی کی کوئی ارفع ترین شکل ہے۔

☆☆☆☆☆

حوالے

(1) Dimitri Nikulin, (Ed.), *Memory A History*, (New York: Oxford University Press, 2015), 5.

(۲) ایضاً، ۱۲۔

(3) Michel Foucault, *History of Sexuality*, V1: An Introduction, (New York, Pantheon Books, 1978), 95.

(۴) تحسین فراقی (مترجم)، فکریات، (کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۰۴ء)، ۲۳۲۔

(۵) میلان کنڈیرا، خندہ اور فراموشی کی کتاب، مترجم: محمد عمر میمن، (کراچی: مکتبہ دانیال، ۲۰۱۸ء)، ۱۰۔

(٦) ایضاً، ۲۲۸۔

(7) Aldous Huxley, *Brave New World*, (Lahore: Ilqa Publications, 2021), 15.

(۸) جارج آرویل، ۱۹۸۴، مترجم ابوالفضل صدیقی، (جہلم: بک کارنر، ۲۰۲۰ء)، ٦۷۔

(۹) ایضاً، ۱۵۱۔

(۱۰) ایضاً، ۲۷۸۔

(۱۱) ایضاً، ۳۰۹۔

(12) Herald Bloom, (Ed.), *George Orwell*, (New York, Infobase Publishing, 2007), 57.

(13) Heral Bloom, *George Orwell's 1984*, (New York, Infobase Publishing, 2004), 45.

(14) Dimitri Nikulin, *Memory A History*, 335.

BIBLIOGRAPHY

- Aldous Huxley, *Brave New World*, (Lahore: Ilqa Publications, 2021)
- Dimitri Nikulin, (Ed.), *Memory A History*, (New York: Oxford University Press, 2015).
- George Orwell, *1984*, (Trans.) Abu al- Fazal Siddiqui, (Jhelum: Book Corner, 2020).
- Heral Bloom, *George Orwell's 1984*, (New York: Infobase Publishing, 2004).
- Herald Bloom, (Ed.), *George Orwell*, (New York, Infobase Publishing, 2007).
- Michel Foucault, *History of Sexuality*, V1: An Introduction, (New York: Pantheon Books, 1978).
- Milan Kundera, *Khundah aur Frāmoshī ki Kitāb*, (Trans.) Muhammad Umar Memon, (Karachi: Mataba-e Daniyal, 2018)
- Tahseen Firaqi, *Fikrīyāt* (Trans.), (Karachi: Academy Bazyat, 2004).

❖❖❖